

شبِ سیاہِ غلامی میں نور کی قندیل

برصغیر کے ایک بہت بڑے مستغرب نے ایک بار آخرت کے لئے اپنے زاوراہ کے بارے میں کہا۔ "جب اللہ مجھ سے یہ پوچھے گا کہ دنیا میں آخرت کے لئے کیا سامان کیا تو میں کہوں گا کہ حالی سے مددس حالی (مدو جزر اسلام) لکھوا کر لایا ہوں۔" مدو جزر اسلام کا اسم بامعنی ہونا قطعاً لاریب ہے۔ لیکن اگر یہی سوال مجھ سے ہوا تو میرا جواب یہ ہوگا۔ "اے اللہ میں نے شاہ جی کی صحبت اگرچہ نہیں پائی لیکن ان کے مشن کو حق سمجھا۔ ان کے افکار پر غور و فکر اور ان کے ارشادات پر عمل کرنے میں لپسی سی سسی ضرور کی۔"

یہ تقریباً ساٹھ برس ادھر کی ایک بہت خاموش وسطِ شب کا واقعہ ہے کہ فضاء اچانک لعرہ ہائے تکبیر فلکِ صافات صداؤں سے لرز اٹھی۔ پیر اہل لاہور نے دس ہزار افراد کے ایک ہجوم کو باغبان پورہ کی طرف بڑھتے دیکھا۔ اسی ہجوم پر ایک نظر ڈالنے سے گٹھ جھمکتی ہوئی، بڑی برسی آسمانوں، سرخ و سفید نورانی چہرہ، لنگی ڈاڑھی، اور لمبے بالوں والے ایک کھدر پوش بزرگ پر جا کر رک جاتی تھی۔ یہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری تھے جو ابھی چار گھنٹے قبل نماز عشاء پڑھانے کے بعد لوگوں سے چند باتیں کہنے کے لئے کھڑے ہوئے تھے۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ تھوڑے سے لوگ ایک بڑے مجمع میں بدل گئے۔ بات انجینئرنگ کالج لاہور کے پرنسپل سے متعلق تھی۔ جس پر الزام تھا کہ وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ عالی میں گستاخی کا مرتکب ہوا ہے۔ پرنسپل کی اس مذموم حرکت پر چند غیور مسلمان طبع مشعل ہو گئے۔ اور اس اشتعال نے بڑھتے بڑھتے چند ہی روز میں ایک بڑی تحریک کی صورت اختیار کر لی۔ جس کی قیادت کی پاداش میں مولانا احمد علی لاہوری، اور مولانا داؤد غزنوی کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ یہ رات کے کوئی ایک بجے کا عمل ہوگا۔ جب ناموس رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے موضوع پر ایک مدلل اور متنوع تقریر لوگوں کو تڑپا رہی تھی۔ پھر ایک مجمع اچانک اٹھ کھڑا ہوا۔ طے یہ پایا تھا کہ نماز فجر کالج کے سامنے ادا کی جائے اور وہیں سے ناموس رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کے لئے اپنا فرض ادا کرنے کا آغاز کیا جائے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ انسانوں کے اس مٹا نہیں مارتے سمندر میں کوئی بھی شخص ایسا نہ تھا جس کے قدم انجینئرنگ کالج کی بجائے اپنے گھر کی طرف اٹھے ہوں۔

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری جنہیں چاہنے والے شاہ جی اور سامنے والے مجددِ خطابت، سلطانِ الشکلیں، امامِ المجاہدین، سید الاحرار اور موسسِ تحریکِ تحفظِ ختمِ نبوت کہتے تھے۔ یکم ربیع الاول (یعنی چاند رات) ۱۳۱۰ھ مطابق ۲۳ ستمبر ۱۸۹۳ء کو جمعہ کی سمر ہندوستان کے صوبہ بہار کے شہر پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ دھیال سے عطاء اللہ اور نخیال سے شرف الدین احمد نام تجویز ہوا۔ والد گرامی کا نام سید ضیاء الدین اور دادا کا نام سید نور الدین شاہ تھا۔ نسب نامہ چھتیسویں پشت میں حضرت سیدنا حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ سے جاتا ہے۔ آپ کے خلع الرشید حضرت سید ابو معاویہ ابو ذر بخاری مدظلہ، العالی کی تالیف "سواطع الانام" کے مطابق آپ کے

خاندان میں سید اللویاء حضرت سید عبدالقادر جیلانی اور سید محمد شاہ جیسے جلیل القدر بزرگ ہو گزرے ہیں۔ ایک اور خاندان سید بزرگ سید عبدالرسول تھے۔ جن کے بارے میں مؤرخ شمس الدین محمد دین فوق نے لکھا ہے۔ "تقویٰ کا یہ عالم تھا کہ مرغی کا انڈہ اور مرغی صرف اس لئے نہیں کھاتے تھے کہ یہ دانہ دیکھا لوگوں کے گھروں میں بھی جا کر کھالیا کرتے ہیں" شاہ جی کی والدہ محترمہ سیدہ فاطمہ اندرابی کا شجرہ حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ سے جاملتا ہے۔

۱۹۱۳ء تک آپ نے قرآن پاک کے حفظ کے ساتھ ساتھ صرف و نحو اور فقہ کی بعض کتب کی تعلیم مکمل کی۔ اسی سال آپ کا عقد آپ کے والد کے چچیرے بھائی سید مصطفیٰ شاہ کی دختر گرامی سے ہوا۔ ۱۹۱۵ء میں آپ نے امرتسر کو مستقر بنالیا۔ اور حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب گولڑوی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہوئے۔ آغاز تعلق کے ایام کے بارے میں فرماتے تھے کہ "اس زمانہ میں بے حد وظائف کرتا تھا۔ طبعیت میں بہت جلال تھا۔ جب کہیں گزرتا تھا تو درخت اور دیواریں پیچھے ہٹتی نظر آتی تھیں" اسی زمانہ میں شاہ جی حضرت مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی کے درس میں شامل ہوئے۔

شاہ جی کے قرآن مجید پڑھنے کا منفرد انداز جب عام ہوا تو یہ آواز لگی کوچوں پر شہر کے بازاروں تک آن پہنچی۔ جب لوگوں نے حضرت قاسمی کو مجبور کیا کہ وہ سید عالی کو کھٹے میدان میں تقرر کی اجازت دیں۔ چنانچہ پہلی تقرر اندرون گلوالی دروازہ بازار کھماراں امرتسر میں ہوئی۔ ایک اور صاحب آپ کو نواحی قصبہ سلطان ونڈلے گئے۔

دسمبر ۱۹۱۹ء میں مولانا شوکت علی کی صدارت میں خلافت کانفرنس امرتسر کے گول باغ میں منعقد ہوئی جس میں پہلی مرتبہ شاہ جی نے سیاسی تقرر کی۔ یہ وہ وقت تھا جب ہندوستانی خفیہ پولیس کی جانب سے تیار کردہ ایک فتویٰ پر مشرق وسطیٰ اور ہندوستان کے مقتدر علماء سے اس مضمون کے دستخط حاصل کئے گئے تھے کہ آل عثمان خادِمِ حرمین شریفین ہونے کے باوجود برطانوی استعمار سے برسرِ جنگ ہونے کی وجہ سے دائرہ اسلام سے خارج اور کافر ہیں۔

رولٹ ایکٹ کی وجہ سے ملک کی سیاسی فضا میں ایک گونہ ارتعاش اور حدت پیدا ہوئی جس سے متاثر ہو کر مسلمانانِ ہند نے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد پہلی مرتبہ اپنے جیا لے رصا کار اور بہترین داغ پروانہ وار فدا کر دیئے۔ چند ہی یوم میں یہ عوامی تحریک محلات اور کوٹھیوں سے جھونپڑیوں، مساجد، پانچہ شالوں اور گوردواروں تک پھیل گئی۔ ایسے ہمہ گیر جذبہ بانی دور سے ناممکن تھا کہ شاہ جی متاثر نہ ہوتے۔ جوانی کا عالم تھا۔ قدرت نے خوش رونی کے علاوہ خوش گلوئی کی نعمت بھی ودیعت کر رکھی تھی۔ چنانچہ ۱۹۱۶ء اور ۱۹۱۹ء کا واعظ اور خطیب تمام آساکوں کو تیاگ کر میدانِ عمل میں اس بے جگرگی سے کود پڑا کہ ماضی قریب، بعید کے بزرگانِ عظمت و استقلال کی درخشندہ تاریخ کو ایک نعرہ عشق سے روشن اور اجاگر کر دیا۔ مولانا سید محمد داؤد غزنوی محلے کی مسجد سے اٹھا کر انہیں سیاست کی سیٹیج پر لے آئے۔ اور ابھی چند ماہ نہ گزرے تھے کہ حضرت شاہ جی کی شہرت اکثافِ ہند میں پھیل گئی۔

سیاسی اور اصلاحی مد و جزر میں وہ کون سا مقام آیا جہاں کلہ حق کو بہانگ دہل بلند کرنے کی حاجت ہوئی اور یہ شیر خدا نتائج سے یکسر بے نیاز ہو کر وقت کے فراعنہ اور نماردہ سے نبرد آزما ہونے کے لئے سب سے اونچے مقام پر نہ دیکھا گیا ہو۔ آزادی کی جنگ ہو یا انگریز کی اسلام دشمنی کے خلاف جہاد، سردار دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی ناموس پر حملوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنا ہو یا بدعات کے خلاف تحریک۔ شاہ جی کا عمل صرفوشی کے لباس میں معاصرین میں سب سے زیادہ افضل اور موثر نظر آتا ہے۔ فتنہ شام رسول ﷺ راج پال ہو یا مغلیہ پہلی ٹیشن، کونٹہ کے مفلوک الحال زلزلہ زدگان کی امداد ہو یا بے کس و مظلوم مسلمانان کشمیر پر ڈوگرہ شاہی مظالم، انتخابات کی سرگرمیاں ہوں یا تحفظ ختم نبوت کے لئے جان کی بازی، غرض ہر مقام اور ہر منزل پر شاہ جی سالار قافلہ کی حیثیت سے رجز خوانی کرتے ملے۔ اور ساتویں اور جاہانوں کے مقابلہ میں زیادہ سے زیادہ سزا کو ہنستے ہوئے قبول کرتے نظر آئے۔ وہ ایک ایسے بے باک اور مضطرب دل لے کر آئے تھے کہ اسلام اور مسلمانوں کی ہر مصیبت کے وقت بے تاب ہو جاتا۔ ان کی آواز اتنی ہر درد تھی کہ برصغیر اور بلاد اسلامیہ کے لئے بے اختیار بلند ہو جاتی۔ آنکھیں عالم اسلام کی ہر تکلیف پر اشک آکود ہو جاتیں۔ ناممکن تھا کہ مظلوم کو شکنجہ میں جکڑا دیکھ کر خاموش رہیں۔ وہ قوم کی تکلیف پر خود روتے اور دوسروں کو رلاتے تھے۔ انہوں نے مصر، ترکی، حجاز الغرض ہر خطہ کے مسلمانوں پر ظلم کے خلاف آواز بلند کی اور ان کے مصائب و آلام پر نوحہ خواں ہوئے۔

زور خطابت کا جب تذکرہ ہوتا ہے تو ہمارے زمانے کے لوگ شیکسپئر کے ڈرامہ جو لسنس سبزر میں انتونی کی تقریر پر سردھننے نظر آتے ہیں۔ معلوم نہیں کہ اس تقریر کا حقیقت میں کتنا اثر ہوا تھا۔ لیکن سب اپنے اور غیر بارہا اس بات کا مشاہدہ کر چکے ہیں کہ ناسوافن ماحول میں جب بھی شاہ جی تقریر کے لئے کھڑے ہوئے عوام کے غم و غصہ کو نہ ہائے تسخیم و آفرین میں بدل دیا۔ جو لوگ جوتے لے کر آئے تھے۔ اپنی جیب سے آخری پائی تک نچھاور کر بیٹھے۔ جو کفر کا فتویٰ صادر کر چکے تھے پھر ان کے ہاتھ تاحیات دعا کے لئے اٹھ رہے۔ ایک بار شاہ جی نے فرمایا۔ "میں وہاں چلا جاؤں گا جہاں سے لوٹ کر کوئی نہیں آیا۔ پھر تم مجھے پکارو گے لیکن تمہاری آواز تمہارے ہی کانوں سے نکلا کر تمہیں بلکان کر دے گی۔ مگر تم مجھے نہ پاسکو گے۔" حقیقت یہ ہے کہ شاہ جی دل و دماغ پر حکمرانی کرتے تھے۔ وہ واحد شخص تھے جو سیاسی اقتدار، جماعتی رقابت اور تنظیمی خطوط کے بغیر اپنی ذات میں ایسا جادو رکھتے تھے کہ لوگ فقط ایک اشارہ پر سر دینے کو تیار ہو جاتے۔ بخاری کی تقریر کسی ہستی میں ہو اور لوگ رات گھروں میں سو کر گزاریں۔ یہ ممکن نہ تھا۔ آپ نے فصاحت و بلاغت، خطابت اور علم کلام کی توہیوں کے دہانے انگریز کے شاہی قلعہ پر مرکوز کئے تھے۔ اختلاف عقیدہ کے علاوہ کادیانیوں سے غیر فانی کہ کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ بانی سلسلہ مرزاہیت (مرزا غلام قادیانی) نے انگریزی حکومت کو ابر رحمت قرار دے رکھا تھا (ازالہ لوہام ص ۱۳۲) اس وجہ سے انگریزی استعمار اور مرزاہیت دو ایسے نشانے تھے جن پر حضرت شاہ جی کے میزائل ہمیشہ لگتے رہے۔ قادیانیت کا ابطال دراصل ختم نبوت کا اثبات ہے جو آپ کے ایمان کا مرکز تھا۔ وہ حق اور حق پرستوں کی گویا ایسی تلوار تھے کہ جس باطل کے سر پر

پڑتی اسے شق کر ڈالتی۔ وہ خدائی بجلی یا آسمانی صاعقہ تھے کہ کفر و صلاحت کے جس خرمن پر پڑتے۔ اسے بھسم کر ڈالتے۔ وہ لہن داؤدی کا ایسا نمونہ تھے کہ حبیب و رقیب سب کو مسور کر دیتے۔ وہ صور اسرافیل تھے جس کی حیات بخش دعوت سے مردہ دلوں میں جان بڑھ جاتی۔ جس کی ایک آواز پر پچاس ہزار رضا کار آزادی کشمیر کے لئے سر پر کفن باندھ کر نکل آتے۔ جس کے ایک اشارے پر متحدہ ہند کے جیل خانے بھر جاتے جس کا داخلہ ایوان مرزائیت قادیان میں زلزلہ ڈل دیتا۔ جنگ آزادی کے کارکنان سے پوچھیے کہ ان کی امروہہ والی تقریر ضرب النسل کے طور پر آج بھی یاد کی جاتی ہے کہ اس نے جنگ آزادی کو نیا رخ دیا۔

۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت کے دنوں میں لاہور سنٹرل جیل میں جب مارشل لاہ کے قیدیوں سے آپ کی ملاقات کرانی گئی۔ تو آپ نگے پاؤں اور نگے سران کے استقبال کے لئے دوڑے۔ آپ نے سب کو گلے لگایا۔ ایک ایک کی بیڑی اور ہتھکڑی کو ہوسہ دیا۔ اور یوں گویا ہوئے "تم لوگ میرے سرمایہ حیات ہو۔ میں نے دنیا میں لوگوں کو روٹی یا پیسٹ یا کسی مادی مفاد کے لئے نہیں نکارا۔ لوگ اس کے لئے بڑی بڑی قربانیاں دیتے ہیں۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت کے تحفظ کی دعوت دی ہے۔ میں نے جب کراچی جیل میں گولی چلنے کے واقعات سنے اور معلوم ہوا کہ کئی بوڑھے باپوں کی لاشیں ٹوٹ گئیں، ماؤں کے چراغ گل ہو گئے، اور کئی سہاگ اجڑ گئے تو مجھے اس کا بہت صدمہ ہوا۔ میں نے وہاں کھانا کھا کر کاش مجھے کوئی باہر لے جائے یا رباب اختیار تک میری آواز پہنچا دی جائے کہ تحفظ ناموس رسول ﷺ کے سلسلہ میں اگر کسی کو گولی مارنا مقصود ہو تو وہ گولی میرے سینے میں مار کر ٹھنڈی کر دی جائے اور کاش اب تک جتنی گولیاں چلائی گئیں مجھے کھٹکی باندھ کر میرے سینے میں مار کر ٹھنڈی کر دی جاتیں۔"

راقم کے دادا مولوی محمد صدیق اسیری کے ان ایام میں شاہ جی کے ہمراہ تھے۔ ان دنوں آپ ۱۳ فروری ۱۹۵۳ء کو بیرون دہلی دروازہ والی تقریر کے سلسلہ میں اسیر تھے۔ یہ وہی تقریر تھی جس میں آپ نے اپنی ٹوپی اتار کر کہا تھا۔ "کوئی ہے تم میں جو یہ ٹوپی خواجہ ناظم الدین (وزیر اعظم پاکستان) کے پاؤں پر جا کر رکھ دے اور یقین دلادے کہ وہ مجھے اپنا سیاسی حریف نہ سمجھیں۔ اگر وہ ناموس رسول کا تحفظ کریں تو میں پوری زندگی ان کا خدمت گار رہوں گا"

جلیلانوالہ باغ کے حادثہ اور قبیح رسوم کے خلاف جہاد نے شاہ جی کو وہ مقام دیا کہ جہاں وعظ فرماتے انسان ہی انسان نظر آتے۔ اسی عہد میں ایک نئی تحریک نے جنم لیا تھا۔ مذہب کے گرد حصار کی نئی استوار ہونے والی دیوار کو گرگانے کے لئے شب و روز مشورے ہونے لگے۔ اور ایک ایسی جماعت کی تنظیم ہو گئی جس کے رزق کا انحصار کذب کے شجر کی آبیاری پر تھا۔ آپ کبھی کبھی بڑے جلال سے فرمایا کرتے تھے "ایک وقت آئے گا کہ تم لوگ ہماری قبروں پر آکر روؤ گے اور کہو گے کہ تمہیں لوگ سچے تھے" انہیں ایام میں ایک تقریر میں فرمایا۔

"میں ان سورتوں کا ریور بھی چرانے کو تیار ہوں جو برٹش امپیریلزم کی کھینٹی کو ویران کرنا چاہیں۔ میں کچھ نہیں چاہتا ایک فقیر ہوں اپنے نانائے ﷺ کی سنت پر مرثنا چاہتا ہوں۔ اور اگر کچھ چاہتا ہوں تو صرف اس

ملک سے انگریز کا اغواء دو ہی خواہشیں ہیں میری زندگی میں۔ یہ ملک آزاد ہو جائے یا میں تختہ دار پر لٹا دیا جاؤں۔

ایک بار صلح سورت میں سکھوں اور ہندوؤں کی دعوت پر ایک تقریر منظور فرمائی۔ اس تقریر کی تاثیر اور حلاوت نے سکھوں اور ہندوؤں سے اللہ اکبر کے نعرے بلند کرائے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی بھی موجود تھے۔ اسلام کی حقانیت، اللہ کی عظمت، توحید اور بت پرستی کی قباہتوں پر حیرت انگیز بیان تھا۔

وہ بھی عجیب منظر تھا جب مئی ۱۹۳۰ء میں انجمن خدام الدین کے اجلاس میں حضرت مولانا انور شاہ کاشمیری نے آپ کو امیر شریعت کا خطاب دیا اور اپنے دونوں ہاتھ آپ کے ہاتھ میں دے کر بیعت کی۔ حضرت شیخ خود بھی زار و قطار رو رہے تھے۔ اور شاہ جی کی آنکھوں سے بھی گویا آنسوؤں کا سیل رواں جاری تھا۔ آپ لاکھ انکار کرتے تھے اور حضرت شیخ اصرار کرتے تھے۔ اس واقعہ کے بعد آپ کی شخصیت میں مقبولیت اور جاذبیت کا وہ دور شروع ہوا جو اس سے قبل کبھی نہ تھا۔

وہ حریت و مساوات کی جنس گراں بار اٹھائے زندگی کے بازاروں میں تقریباً نصف صدی تک لوگوں کو ہر لفظ بلائے رہے۔ انہوں نے اس گورستان میں برسوں اذانیں کہیں۔ لیکن غلام رگوں کے سبب خون کو اپنی گرم گفتاری سے حرکت میں نہ لاسکے۔ اوریوں یہ بد نصیب لوگ اب شاید ہمیشہ کے لئے غلام ہو گئے۔ اگر بخاری پہاڑوں کو پکارتے تو شاید خاک راہ بن کر دامن سے لیٹ جاتے۔ اگر ستاروں کو آواز دیتے تو وہ یقیناً اپنی قدیمیں زمین کے حوالے کر دیتے مگر آہ! بخاری نے ان کے دروازوں پر سر پٹکا جن کے دل خون سے تھے، آنکھیں بصارت سے محروم اور کان صدائے حق سے نا آشنا تھے۔ یا بالفاظ دیگر وہ لوگ

ختم اللہ علی قلوبہم وعلی سمعہم وعلی ابصارہم غشاوة۔
کی حقیقی تفسیر تھے۔ دردناک اور فلک شگاف آواز کے ساتھ قرآن کا پڑھنا، عالم و جاہل اور مخالف و موافق سب کا یکساں طور پر متاثر ہونا ان کی وہ خصوصیات ہیں کہ کوئی ان کی، ہماری کنبی نہیں سکتا۔ مخالفین کو ہم خیال بنانا ان کے بانیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ بعض اوقات تو بولنے سے قبل ہی مجمع کو ایک ساحرانہ نگاہ سے مسح کر دیتے تھے۔ اپنے مخالف پر یوں حملہ آور ہوتے کہ ایسا خطیب کسی نے دیکھا ہو گا اور نہ سنا۔ فکری تحلیل سے وہ نقشہ کھینچتے تھے کہ دنیا کا کوئی مقرر ان کی نقالی نہیں کر سکتا۔ احرار کی قیادت کے زمانہ میں آپ کے دین مبارک میں دو دھاری زبان اور باطن میں قلب جبار تھا۔ جس نے قادیانیت کا جنازہ نکال دیا۔ مولانا محمد علی جوہر کی خطابت اور قیادت دونوں مسلم الثبوت ہیں۔ ایک بار شاہ جی کے بارے میں فرمایا۔ "ظالم سے نہ پہلے تقریر کی جاسکتی ہے نہ بعد میں۔ اس کے بعد تقریر کرنے والے کا رنگ نہیں جتنا اور اگر اس سے پہلے تقریر کریں تو اس کے اثر کو اگر یہ مٹا دیتا ہے۔"

لہذا رام والے کس کے سلسلہ میں ایک گواہ سید مقبول شاہ جوان دونوں اللہ موسیٰ میں ہید کا شکیل تھا کہتا ہے۔ "جب میں ہائی کورٹ میں شاہ جی کے خلاف شہادت دینے کے لئے گیا تو لاہور کے سپرنٹنڈنٹ سی آئی ڈی نے مجھے خاص طور پر ہدایت کی کہ دوران شہادت شاہ جی سے آنکھ نہ ملانا۔ اگر آنکھ مل گئی تو شہادت نہ

دسے سکو گے۔ یہ واقعہ حضرت مرحوم کی مقناطیسی شخصیت کی ایک ادنیٰ مثال ہے۔

شاہ جی دوسروں کی عیوب کی پردہ پوشی فرماتے تھے۔ کسی کی دل آزاری ان کا شیوہ نہ تھا۔ صلح کل ان کا مسلک تھا۔ ان کے منہ سے کسی نے جھوٹی بات نہیں سنی۔ وہ اس بات یا روایت کو ہرگز بیان نہ کرتے جس کی صحت میں انہیں ذرہ برابر بھی شک ہوتا۔ بے حد منکسر المزاج تھے۔ آخری ایام میں ایک بار فرما رہے تھے۔ "میری زندگی ہی کیا ہے؟ میں کیا ہوں؟ نہ نبی ہوں نہ ولی۔ خدا کی مخلوق میں سب سے برا اور عاجز!!"

سیرے گناہوں پر میرے مالک نے پردہ ڈال دیا۔ ورنہ عطاء اللہ جیسے کوڑوں مارے مارے پھرتے ہیں جنہیں کوئی جانتا تک نہیں۔ یہ اس کا کرم ہے کہ اس نے قرآن کی کچھ خدمت مجھ سے لے لی۔ اور اس پر بھی کوئی دعویٰ نہیں۔ استغفر اللہ! پوری زندگی میں کہا ہوا کوئی ایک حرف بھی قبول ہو گیا تو نجات ہو جائے گی۔ ان شاہ اللہ۔ نجات کی امید ضرور رکھتا ہوں۔ کیونکہ اتنا مجھے یقین ہے کہ میں نے اس کے سوا کسی کو خدا نہیں مانا۔ اور میاں صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی کو ان کا حریف بننے دیکھنا میں برداشت نہیں کر سکتا۔ اور کوئی عمل میرے پٹے نہیں۔ بس اسی کے فضل و کرم کے سہارے جی رہا ہوں۔"

۹ ربیع الاول ۱۳۸۱ھ مطابق ۲۱ اگست ۱۹۶۱ء کی شب اہل مٹان نے یہ دغراش خبر سنی کہ محفل عزم و عمل کا وہ چراغ جو کئی برس سے مرض و ضعف کے شدید جھوٹوں سے مجھ بھگت سنبھل جاتا تھا۔ ۷۲ برس کی حنا گستریوں کے بعد بالاخر آج شام چھ بج کر پچھپن منٹ پر ہمیشہ کے لئے بجھ گیا۔ وہ جس کے دروازے پر بڑے بڑے روسا، آفیسرز، وزراء، علماء اور صوفیاء حاضری دینا باعث صد افتخار گردانتے تھے کرائے کے ایک بوسیدہ مکان میں اپنی زندگی گزار کر خوش رہا۔ بڑے بڑے بادشاہوں کے جنازے یوں نہ اٹھے ہوں گے جیسے اس فقیر کا جنازہ اٹھا۔ جنازہ اٹھائے جانے کے وقت دو لاکھ سے زائد خوش قسمت عقیدت مندوں نے ایمر سن کالج گراؤنڈ مٹان میں آپ کے بڑے فرزند اور جانشین حضرت ابو معاویہ ابو ذر بخاری مدظلہ العالی کی امامت میں نماز جنازہ ادا کی۔ ڈیپٹی کمشنر مٹان نے حکومت کی جانب سے قلمہ مٹان میں تدفین کی پیش کش کی۔ جسے شاہ جی کے اہل خانہ نے مسترد کر دیا اور عام قبرستان میں دفن کرنے کا فیصلہ کیا۔ آخری ایام میں آپ اکثر فرماتے تھے۔ "اللہ مجھے ایسے مقام پر قبر نصیب کرے جو سر راہ ہو اور آتے جاتے لوگ فاتحہ پڑھ جایا کریں" ۲۲ اگست کی شام چھ بجے جلال باقری قبرستان میں برب سرک آپ کو سپردِ دلہ کیا گیا۔ شاہ جی ہمیشہ کے لئے منوں مٹی تلے سو گئے۔ لوگوں کی گریہ و زاری کی انتہا ہو گئی۔ برصغیر کی تحریک آزادی اور جہاد دین کا ایک نہایت منور باب اپنے اختتام کو پہنچا اور دنیا اس بلبل ہزار داستان کی نغمہ طرازیوں اور خوش الحانیوں سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گئی۔ جو خرسن باطل پر بھلی کی مانند ٹوٹتی تھی۔

آج مٹی کا وہاں دھیر سا ہو گا ساغر

سر جھکاتی تھی جہاں لوح و قلم کی دنیا